پہاڑی شاعری میں فطرت نگاری

☆



پہاڑاں دی جھولی دے واسی، فطرت دے پروانے لوک
کجھ نہ پچھو کسراں جیندے مستی وچ مستانے لوک
گاندے جھمر، نچدے پکھرو، جنگل بیلے دی دُنیا
اپنے اندر شہر بسا کے شہراں تھیں بیگانے لوک!

☆

تحریر: محمد مقبول ساحل، سرینگر کشمیر

فطرت نگاری یا نیچرل ازم صرف قدرتی مناظر کے بارے میں لکھنے کا نام نہیں' جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ محض درختوں، پھولوں، جنگلوں، پہاڑوں، پرندوں، گلہریوں اور چوپایوں وغیرہ کا ذکر ہی فطرت نگاری نہیں۔ لفظ 'فطرت' ہی کو دیکھ لیں، اس کا دامن لغوی اعتبار سے کتنا وسیع وعریض اور بلند وبالا ہے۔ حفیظ صدیقی کی تنقیدی اصطلاحات کی کتاب 'اصنافِ ادب' کے مطابق ادب اور فن کی دنیا میں لفظ فطرت چار مختلف مضمونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صحیفۂ فطرت یعنی خارجی کائنات، قوانین فطرت، ہر چیز کی مخصوص افتادِ طبع اور انسانی سرشت۔ ادب وفن میں یہ اصطلاح وسیع معانی کی حامل ہے۔ اشیاء، انسان اور دیگر جاندار، مظاہرِ قدرت اور ان کی طبعی حالت، انسانی جبلت، سادہ پرستی، یہاں تک کہ طبعی اخلاق اور مذہب بھی 'نیچرل ازم' میں آتے ہیں۔ اس لحاظ سے فطرت نگار یا 'نیچری' محض مظاہرِ فطرت کے بارے میں لکھنے والا یا اُن کی منظر نگاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ فطرت میں عقیدہ رکھنے والا، فطرت پرست، طبعی تاریخ، علم طبیعات اور حیوانات کا ماہر بھی ہوتا ہے۔ دراصل فطرت نگاری حقیقت نگاری کا وہ انداز ہے، جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں نمودار ہوا اور جسے فرانسیسی ادیبوں زولا اور موپساں نے اپنایا۔ ادبی مواد اور موضوعات میں آزادی اور فطری انسانی جذبات واحساسات کا اظہار اس ادبی اسکول یا مسلک کی اہم خصوصیات ہیں۔ اگر فلسفے کی رُو سے دیکھا جائے تو ادب میں 'جمالیات' مظاہرِ فطرت ہی کی دین ہے اور جمالیاتی حسیات میں انہی مظاہر کا اظہار جھلکتا ہے۔ شاید ہی کوئی اعلیٰ درجے کا ادب یا فن پارہ ہو جس میں مظاہرِ فطرت کے اثرات موجود نہ ہوں۔ فیثا غورث، سقراط، ارسطو، ہیگل اور دیگر فلسفیوں کے نظریات کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ادبی جمالیات، تخلیقی قوت اور مظاہرِ فطرت کا باہمی تعلق کتنا گہرا ہے۔ ارسطو نے تو فطرت کو تخلیق کا سب سے بڑا استعارہ قرار دیا ہے جبکہ ہیگل نیچریت کے فلسفے کا بانی تھا۔

اردو ادب میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں کی تحریک نے اردو نظم میں فطرت نگاری پر بڑے اثرات مرتب کیے اور ادب میں فطرت نگاری ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ سرسید کے مخالفین طنزاً انہیں 'نیچری' کہا کرتے تھے۔ اردو میں نیچرل شاعری کی اصطلاح مولانا آزاد اور مولانا حالی کے ذریعے متعارف ہوئی۔ جدید نظم کے تشکیلی دور میں عبدالحلیم شرر کی مثال دی جا سکتی ہے جو علی گڑھ تحریک

کے رُکن بھی تھے۔

میرا ذاتی ماننا ہے کہ فطرت نگاری اور حب الوطنی کا آپس میں کافی گہرا رشتہ ہے کیونکہ ایک فطرت شناس شاعر جب بھی باغ و بہار، دریا و کہسار اور گل و بلبل کی بات کرتا ہے تو اس کے پیشِ نظر اپنا ہی مادرِ وطن ہوتا ہے، میں نے آج تک ایسی کوئی مثال نہیں دیکھی کہ کسی شاعر نے کشمیر میں بیٹھ کر چیکوسلواکیہ کے قدرتی مناظر کے بارے میں قصیدہ خوانی کی ہو یا پنجاب میں بیٹھ کر چین کے خون جما دینے والے برفانی کوہساروں کی مدح خوانی کی ہو بلکہ اس ضمن میں ایک مثال پیش کرنا مناسب لگتا ہے۔ سال 2009ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے لیہہ لداخ میں قلمکاروں کا ایک دس روزہ کیمپ منعقد ہوا، جس میں راقم کے ہمراہ ریاست کی سبھی نو زبانوں کے قلمکاروں نے حصہ لیا، کیمپ کے آخری دن حکم ہوا تھا کہ ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے گا، جس میں لداخ کے حوالے سے اشعار پڑھے جائیں گے یعنی ان دس ایام میں قلمکاروں کو لداخ کے بارے میں جو تجربات ہوں گے یا وہ جن چیزوں سے متاثر ہوں گے، ان کا منظوم ذکر کیا جائے گا۔ اس مشاعرے میں میری آزاد پہاڑی نظم ''دل دی عرضی'' جس میں راقم نے خود کو لداخ کے ویرانے سے اور اپنے محبوب کو گلستان کشمیر سے تشبیہ دی تھی، سُن کر لداخی دوستوں کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ راقم نے صاف لکھا تھا کہ لداخ میں نہ تو کہیں پھول ہیں، نہ باغ ہیں، نہ بلبل ہے اور نہ ہی کوئی دلکش قدرتی نظارہ بلکہ یہ جگہ (میرے دل کی طرح) دور دور تک بے آب و گیا ریگستان ہے اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوں کہ یہاں کے باشندے اس ماحول میں زندہ کیسے رہتے ہیں... لیکن جونہی میری نظم ختم ہوئی تو لداخی شعراء میدان میں کود پڑے اور انہوں نے اپنے مادرِ وطن کی شان میں ایسی قصیدہ خوانی کی کہ میں اپنا حال تک بھول گیا، اُنہوں نے ریگستان کو گلشن، بے آب و گیا بیابانوں کو مرغزار اور سرد زمستانی ہواؤں کو بادِ نسیم بنا کر پیش کیا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں نے ان کی نازک رگ کو دکھایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ فطرت نگاری دراصل حب الوطنی کی دوسری شکل ہے اور ایک شاعر یا قلمکار جب بھی قدرتی مناظر کی تعریف کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کا اپنا مادرِ وطن اور اس میں موجود قدرتی نظارے ہی ہوتے ہیں، رابندر ناتھ ٹیگور کی 'وندے ماترم، جن گن من' اور علامہ اقبالؒ کی 'سارے جہاں سے اچھا، ہمالہ اور اسی طرح کی بے شمار منظومات کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، سوائے اس کے کہ کوئی ایسا مقام یا علاقہ، جس کے ساتھ شاعر یا قلم کار کا کوئی روحانی یا مذہبی تعلق ہو، مثلاً کعبہ کاشی وغیرہ۔

جہاں تک پہاڑی شاعری یا ادب میں فطرت نگاری کا تعلق ہے تو یہ کہنا خالی از معنی نہیں ہوگا کہ پہاڑی قلمکار بجائے خود ایک ایسے روح پرور ماحول میں تربیت پاتا ہے، جہاں وہ عمر کے ساتھ ساتھ خود بخود ایک فطری ماحول سے واقف ہوتا رہتا ہے، حضرت میاں محمد بخشؒ کی شہرہ آفاق مثنوی 'سیف الملوک' میں فطرت نگاری، اول تا آخر قدم قدم پر ملتی ہے۔ اس عظیم شاہکار میں فطرت نگاری کے بے حساب نمونے موجود ہیں بلکہ کتاب کا اغاز ہی جس حمد یہ کلام سے ہوتا ہے، اس کا دوسرا ہی شعر شاعر کو اللہ پاک کی تخلیق کردہ خوبصورت کائنات کی طرف موڑ دیتا ہے اور وہ دعائیہ انداز میں عرض کرتا ہے:

سدا بہار دیویں اس باغے، کدیں خزان نہ آوے
ہوون فیض ہزاراں تائیں، ہر بھُکھا پھل کھاوے

ترجمہ: ''(اے میرے خالق و مالک) میرے اس باغ کو ایسی لازاول بہار عنایت فرما، جس میں کبھی بھی خزاں نہ آسکے، اس میں اپنے اتنے فیوض و برکات برسادے کہ کوئی بھی بھوکا پیاسا باقی نہ بچے''

اس کے بعد شہزادہ سیف الملوک کی پیدائش سے لے کر وصال تک قدم قدم پر فطرت نگاری کے نادر نمونے ملتے ہیں، قدم قدم پر پھولوں، باغات، حسین قدرتی مناظر، دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں، پریوں اور دلوں کو محسور کردینے والے قدرتی مناظر قاری کو ایک زنجیر میں جھکڑے رکھتے ہیں۔ پہاڑی شعراء اور قلمکار اس کتاب کو اپنے فن کی بنیادی میراث مان کر ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اسی طرح سائیں قادر بخش اور سائیں فقر دین نے بھی فطرت نگاری کے خوبصورت مناظر اپنے اشعار کے ذریعے پیش کئے، جو پہاڑی شاعری کی ایک صنف 'چار بیتے' میں کھلے طریقے سے فطرت کے ترجمان ہیں، بہت سارے چار بیتے فطرت نگاری کے بہترین نمونے ہیں، جدید شاعری میں بھی یہ اثرات ہر گام پر ملتے ہیں۔ پہاڑی شاعر کسی نہ کسی طرح فطرت نگاری کرتا رہتا ہے، پہاڑی غزل اور نظم نگاروں نے اس ضمن میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ پہاڑی کے قدیم شعراء کے کلام کا آغاز ہی فطرت نگاری سے ہوتا ہے۔ ابتداء کسی نہ کسی طرح سے حمد یا نعت شریف سے ہوتی ہے تو پہاڑی شاعر کا اگلا مرحلہ اپنے وطن کی خوبصورتی کی تعریف کرنا اور اسے ساری دنیا میں واحد و یکتا اور حسین و جمیل بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس کے رگ و پئے میں اس کے اردگرد کے نظاروں، فلک بوس پہاڑوں، گیت گاتی ندیوں، جھرنوں، لہلہاتے کھیتوں اور نغمہ سرا مرغانِ کہسار کا خمیر شامل ہوتا ہے اور وہ اپنے مادرِ وطن کا قرضہ لوٹانے کی اولاً کوشش کرتا ہے۔ یہی حال نئے پہاڑی شعرا کا بھی ہے، بہت ہی اور بہت سارے خوبصورت گیت لکھے جارہے ہیں۔ پہاڑوں کی جھولی میں پلنے والے یہ نوجوان فطرت نگار شاعر قدرت کے شاہکاروں کو اپنے اشعار میں ایسے سموتے ہیں کہ سننے والا ششدر رہ جاتا ہے۔ جب وہ اپنے آبائی علاقوں کے بارے میں گیت لکھتے ہیں تو سننے والا خیالات میں ہی ان علاقوں کی سیر کرآتا ہے۔

پہاڑی شعرا کی فہرست مرتب کرنا قدرے مشکل کام ہے اور اس کے لیے کافی عرق ریزی درکار ہے، میری پہنچ جہاں تک ممکن ہوسکی، میں نے اس سمندر کے لعل و جواہر کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جو دولت میرے پاس جمع ہوئی ہے، اس میں مندرجہ ذیل شعراء تعلق پہاڑی زبان وادب کے 'اکال تخت' کہلانے والے علاقے کرناہ سے ہے، ان میں انعام یافتہ شاعر اور گلوکار عبدالرشید قریشی، اُن کے مرحوم برادر نوُر احمد قریشی، مرحوم لعل دین مظلوم پٹھانیہ، غلام ربانی اعوان، لقمان راہی، عبدالرشید لون غمگین، غلام حیدر ندیم، خورشید منور، اقبال نسیم، سیف علی خان سیفی، حمید ماگرے، عبدالرزاق شمسی، ماسٹر زمان علی کھوکھر، نشاط افروز نعیم، راجہ افلاک خان، عبدالہادی قریشی، میر عالم منصور، ماسٹر محمد مقبول، شیخ شبیر احمد، محمد ایوب نعیم کرناہی، رفیق مخلص اور مشکور شاد شامل ہیں۔ اگر تھوڑا سا بائیں جانب یعنی کشمیر کے قدیم صدر دروازہ اوڑی اور اس سے ملحقہ بارہمولہ، بانڈی پورہ، لار، کنگن، ٹنگمرگ اور گاندربل کی طرف نگاہ دوڑائیں تو پہاڑی فطرت شناس اور فطرت نگار شعراء کی اس سے بھی طویل ایک اور قطار دکھائی دیتی ہے، جس میں نورالدین ناز، اقبال

سرحدی، عزیز دچھنوی، حنیف دلبر، امجد حسین کاظمی، عطاء اللہ ممتاز، احمد دین انور، فیروز الدین بیگ، حفیظ بونیاری، سلیم احمد، راجہ الیاس ہمدم، ریحانہ عزیز، زریں آراء معصوم، محمد عظیم خان، محمد سرور ریحان، مجروح ملنگامی، محمد شفیع صابر، رخسانہ پروین کوثر، عبدالرؤف قریشی، محمد اسحاق تبسم، غلام الدین جزاء، سید انور شاہین، معراج راہی عبدالمجید حسرت اور اشفاق دانش ترک شامل ہیں۔ اسی طرح جنوبی اور وسطی کشمیر یعنی کوہ ہمالیہ اور پیر پنچال کی پہاڑیوں کے دامن میں نئے اور پرانے پہاڑی شعراء کا ایک طویل قافلے کا قافلہ قدرتی مناظر کا حدی خوان بنا دکھائی دیتا ہے، ان میں ظفر اقبال خان منہاس، ماسٹر غلام الدین شکیبا کریوی، مرحوم ماسٹر دل محمد ڈار ندیم (راقم کے ماموں جان اور استاد) عبدالواحد منہاس، محمد ضیاء الرحمٰن منہاس، محمد اقبال شیخ علی جان پرواز، لیاقت علی قریشی، عنایت اللہ خان اور راقم (مقبول ساحل) کا نام شامل ہے۔ وادیٔ جنت نظر کے مغرب میں پیر پنچال کے اُس پار دیکھیں تو پہاڑی شاعری کی سرزمین اور بھی زیادہ شاداب، سرسبز اور زرخیز دکھائی دیتی ہے۔ اس میں ایسے ایسے قادر الکلام اور صاحب قلم شعراء موجود ہیں، جن کا ہر شعر قدرتی مناظر کی تعریف سے لبریز اور ادبی بلوغت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ پونچھ اور راجوری سے تعلق رکھنے والے ان پہاڑی شعرا کی فہرست کو اگر مختصر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے خدوخال کچھ اس طرح سے ابھرتے ہیں:۔ شیخ آزاد احمد آزاد، مستور احمد شاد، کے ڈی مینی، پرویز مانوس، جمال الدین جمال، امتیاز نسیم ہاشمی، نذیر احمد بھٹی، شیخ ظہور احمد، خورشید کرمانی، نذیر اِنس، حاجی بشیر احمد شاد، ڈاکٹر علمدار حسین، محمود احمد طاہر، لیاقت نئیر، لیاقت جعفری، ڈاکٹر صابر مرزا، نثار راہی، ڈاکٹر مرزا فاروق انوار، رشید قمر، ڈاکٹر انور، پرویز ملک، ذاکر فیاضی، قاری محمد اشرف، نورالدین صابر، شفیق عارش اور عارف جرال عارف۔ اگلی سطور میں ان شعرا کا نمونہ کلام اور اس کا آسان اردو ترجمہ آ رہا ہے۔

پہاڑی زبان کے شہرہ آفاق شاعر اور نقاد محمد عظیم خان کا کہنا ہے کہ فطرت نگاری بنیادی طور پر وہی شاعر کر سکتا ہے، جو موضوعاتی شاعر ہو کیونکہ ایک موضوعاتی شاعر جب کسی نظم یا گیت کا عنوان باندھتا ہے تو وہ اس کے ایک ایک حرف اور شعر میں فطرت کے موتیوں کو سجاتا چلا جاتا ہے، عظیم خان کی منظومات گلمرگ، وادی کشمیر اور وادی لولاب نمائندہ فطرت نگاری کی مثالیں ہیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ پہاڑی شاعر پیدائشی طور پر فطرت نگار ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنی آنکھ فطرت کی بانہوں میں ہی کھولتے ہیں اور یہیں ان کی پرورش ہوتی ہے۔ مجروح ملنگامی ایک ایسے فطرت شناس شاعر ہیں جن کی پوری شاعری میں خالقِ کائنات کی حمد وثناء اور اس کی بنائی ہوئی کائنات کی تعریف ملتی ہے۔ نئے پہاڑی شعراء اگرچہ پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر شہروں میں آنے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے ماحول سے غافل نہیں رہتے۔

پہاڑی شعراء کا یہ خاصا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس جمالیاتی حس سے نوازا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ فطرت سے آنکھ لڑائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر سفر العشق المعروف مثنوی سیف الملوک کے خالق اور صوفی شاعر حضرت میاں محمد بخشؒ سے آغاز کیا جائے تو وہ قصہ سیف الملوک کے ہر موڑ پر، جہاں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ قاری تھکنے یا بور ہونے لگا، کسی نہ کسی بہانے ایسا ماحول بنا دیتے ہیں کہ قاری قدرت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر تھوڑی دیر سستا لیتا ہے، تازہ دم ہو کر اُٹھتا ہے اور آگے بڑھنے کی سعی کرتا ہے۔ مثال کے

طور پر شہزادہ سیف الملوک کی پیدائش کے وقت وہ ماحول کی عکاسی کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

شہزادہ سی لعل چمکدا، سورج شکل پیارا
نگ موتی صالح دا بیٹا، چن جیہا چمکارا
سورج ویکھ شہزادے صورت چھپ بدلے دن کٹدا
ویکھ وزیرے دے فرزندے چودھویں دا چن کہٹدا

شاعر فرماتے ہیں ''جب شہزادہ سیف الملوک تولد ہوا تو اس کی صورت اتنی پیاری تھی کہ گویا کوئی ہیرا موتی چمک رہا ہو، گویا سوج بادلوں میں سے نکل آیا ہو، صالح کا بیٹا گویا چمکتا چاند تھا اور گویا اس سورج کو دیکھ کر اصلی سورج شرم کے مارے بادلوں میں منہ چھپا رہا ہو اور چودھویں کا چاند شرم کے مارے گھٹ گیا ہو''

ان چار سطور کو غور سے دیکھا جائے تو جس طرح سے شاعر نے سیف الملوک کو ہیرے موتی، لال و جواہر، چمکتے اور مکمل چودھویں کے چاند سے تشبیہہ دی ہے، یہ سب دراصل فطرت کی تعریف ہے اور خالق کائنات سے گفتگو ہے کہ اس نے دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور حسین و جمیل چیزیں تخلیق فرمائی ہیں، جن کے ساتھ ایک دوسرے کو تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ اسی باب میں جب شہزادہ تھوڑا بڑا ہو کر ایک باغیچے میں سیر کے لیے جاتا ہے تو باغ اور اس کے پھول اس کا استقبال کچھ اس طرح سے کرتے ہیں، یہ دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گلخیرے پھُل کرن دعائیں، خیریں آ سُلطاناں
لہریے لے ریحان کھلوتے، زیور پہن شاہاناں!
سبزے فرش وچھایا سوہنا صاف ذمردنالوں
دور کھلارے، چھتر چھوہارے نسرین تانے سالوں

ترجمہ: ''کھلے ہوئے پھول یہ دعائیں کر رہے ہیں کہ سلطان (شہزادہ) خیریت کے ساتھ باغ میں پہنچے، گلِ ریحان اپنی بانہیں پسارے اور ہاتھوں میں زیور لیے کھڑا ہے، زمین پر ذمرد جیسا خوبصورت مخمل کا فرش بچھ چکا ہے اور دور دور تک میٹھے اور لذیز میوے اور مشکبار پھول سجا دیے گئے ہیں''

شاعر چاہتا تو شہزادے کی آمد کو دنیاوی دبدبے سے تشبیہہ دے کر یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ اس کے راستے میں وزیر و افسر، فوج ولشکر، ہاتھی گھوڑے اور لوگوں کا ہجوم تھا، جو اس کے استقبال کا منتظر تھا اور وہ شاہی جاہ و جلال کے ساتھ باغ میں داخل ہوا لیکن نہیں، چونکہ شاعر کے اندر ایک فطرت شناس روح انگڑائیاں لے رہی ہے، اس لئے وہ اس کے استقبال کے لیے فطری انتظامات کرتا ہے، جس میں نرمی،

نزاکت، خوبصورتی، خوشبو اور حسین و جمیل نظارے شامل ہیں اور یہ ایک پہاڑی صوفی شاعر کا ہی خاصہ ہوسکتا ہے۔

یہ عالم تو تھا حضرت میاں محمد بخشؒ کا، ان کی تصنیفات میں قدرتی مناظر کی جو فراوانی ہے، اسے بیان کرنے کے لئے کئی ایک کتابیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن اگر اس کے بعد کے شعراء میں سے ایک اور برگزیدہ صوفی شاعر سائیں قادر بخشؒ کی منظر نگاری کو دیکھا جائے تو اس کے نظارے بھی کسی سے کم نہیں، پیش ہے اُن کی مشہور 'سی حرفی' کا ایک بند:

خ۔خشک ہویا باغ حسن جوبن، دیوئے خبر کون اساہڑے مالیاں نوں
بادِخزاں نے چمن ویران کیتا، آکے ویکھ پہاویں پھلاں، ڈالیاں نوں
غنچے، برگ، پھل آندے نظر ناہیں، لے کھاں سرت اج کل ہتھیں پالیاں نوں
قادر یار! بہار نچ لا پانی، مولن پھُل لگن شاخاں خالیاں نوں

ترجمہ: میری جوانی اور حسن کا باغ سوکھ گیا ہے لیکن میرے مالی (محبوب) کو اس کی خبر ہی نہیں، خزاں کی سرد اور تیز ہواؤں نے پورے چمن کو ویران کر دیا ہے (اے میرے محبوب!) اگر میرا یقین نہیں تو پھر خود آ کے لے دیکھ لے، غنچے، پتے اور پھول کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں، دیکھ! آج اس باغ کی کیا حالت ہوگئی ہے جو تو نے کبھی اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، قادر یار! اب اس باغ کو ازسرِ نو سیراب کرنا ہوگا تا کہ اس کی خالی ٹہنیوں پر پھر سے پھول کھل سکیں''

دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شاعر ایک جانب اپنے دل کی حالت کی ایک خزاں رسیدہ باغیچے سے تشبیہہ دیتا ہے، جو اس کے محبوب کی لاپرواہی کی وجہ سے ویران ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی اُس نے نہ تو ہمت چھوڑی ہے اور نہ ہی اسے کوئی مایوسی لاحق ہے، وہ ایک وفادار عاشق کی طرح اسی اُجڑے ہوئے باغیچے کو ازسرِ نو سیراب کر کے اس میں ایک نئی بہار کی امید بھی کرتا ہے (بے وفاؤں کی طرح کسی دوسری شاداب بہار کی طرف نہیں بھاگتا) یعنی اسے اپنے محبوب سے امید ہے کہ ایک دن وہ ضرور لوٹ کر واپس ائے گا لیکن تب تک ضرورت اس بات کی ہے کہ دل میں اُس کی محبت (کے پھولوں) کو تازہ رکھا جائے۔

سائیں زمان چن پہاڑی زبان کے قدیم اور اعلیٰ پایہ کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں، ان کی سی حرفی آج بھی زبان زدِ عام ہے اور پہاڑی لوگ ان کے کلام کو گھروں میں تمثیلاً آج بھی سنتے اور سناتے ہیں، زمان چن سی حرفی ایک بند میں قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ایک باغ کی ویرانی سے کچھ اس طرح تعبیر کرتے ہیں:

ے

ب۔ باداس باغ پر سخت غالب، اوڑک ہک دن بادِخزاں پھرسی

گل، گلاب رویل بسنت اُتے، موقعہ زردیاں دانا گہاں پھرسی

تک درخت بے رخت، بے برگ بلبل، کرداپہو روی شور وفغان پھرسی

ویکھ چمن زمان! ویران گُلشن، پریشان ہو کے باغبان پھرسی

(ترجمہ: (ایک دن ایسا بھی آئے گا جب) اس خوبصورت باغ پر بادِصرصر غالب آجائے گی اور آخرکار یہ خزاں رسیدہ ہو جائے گا، پھولوں اور بہاروں پر خزاں کی ناگہانی زردی چھا جائے گی، درختوں سے ہریالی کا لباس چھین لیا جائے گا اور بلبل کے ساتھ ساتھ بھنورے بھی آہ وفغاں کرتے نظر آئیں گے، اے زمان چمن! یاد رکھ، اُس دن خود باغبان بھی حیران و پریشان پھرے گا''

زمان چمن کا مقصد روز قیامت کا حال بیان کر کے اپنے قاری کو خوفزدہ کرنا بھی ہے اور ساتھ ہی وہ قدرتی مناظر کا دوسرا یعنی ویران پہلو دکھا کر یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس بات پر غور کریں کہ اگر یہ نظارے ویران ہو جائیں تو کتنے بدصورت اور ڈراونے معلوم ہوں گے، اس لیے جب تک گلشن میں بہار ہے، اس کا مزہ لیا جائے اور ساتھ ہی اس کے انجام کو بھی یاد رکھا جائے۔

جدید پہاڑی شعرا کی قدرتی منظر نگاری کا ذکر کریں تو آغاز حسام الدین بانڈے کے ان دو اشعار کے ساتھ کیا جا سکتا ہے

ے

بچ مداناں، ندیاں بگن، ٹھاٹھاں مارن دریا

کھیتاں باغاں اندر بوٹا بوٹا میوے پہر یا

شاعر قدرتی مناظر کی جانب متوجہ ہو کر اپنے وطن کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ''میدانی علاقوں میں دریا بہتے ہیں اور ندیاں ٹھاٹیں مارتی ہیں جبکہ کھیتوں اور باغات میں ایک ایک درخت اور پودا میووں اور فصلوں سے بھرپور ہے. وہ اگلے شعر میں کہتے ہیں:

دُنیا اُپر جنت سمجھو، ایہہ ماہڑا کشمیر

اسنے پانی ٹھنڈے، مٹھے، جوں شکر تہ شیر

ترجمہ: ''دنیا میں اگر کسی کو جنت دیکھنی ہے تو وہ میرے کشمیر کو دیکھ لے، جہاں ٹھنڈے اور صاف پانی کی ندیاں یوں بہتی ہیں، گویا ان میں دودھ اور شہد ملا ہو''

اس شعر میں بھی قدرتی مناظر کی تعریف 'حب الوطنی' کے ہی تناظر میں کی گئی ہے کیونکہ شاعر پہلے کہتا ہے ''میرا کشمیر'' اور اس کے بعد وہ تعریف کے لئے اپنے لب کھولتا ہے۔

'سی حرفی' کی بحر کا استعمال کرتے ہوئے قدرتی مناظر کی مصوری کرنے کی ایک اور کوشش ملاحظہ فرمائیں، پہاڑی زبان کے ایک اعلیٰ پایہ شاعر عبدالعزیز ندیمؔ اپنی ایک نظم 'وطن دا منظر' کا آغاز کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

ے

ماہڑے ملک دے اُچے پہاڑ سوہنے، جنہاں بچ تاریخ دا راگ بسدا
کُرے بنجلی دی اواز ایندی، کُرے اُچے فقیر دا باغ بسدا
جنہاں رب دے عشق دی طلب ہوئی، کہٗر اُنہاں اپنے ویران کیتے
نسدے شور شرابے تھیں دور سجناں، بچ جنگلاں ڈھونڈدے پیار اُس دا

''ترجمہ: میرے وطن کے اونچے اور خوبصورت پہاڑوں میں کئی زمانوں کے راگ چھپے ہوئے ہیں، کہیں سے بانسری کی آواز آرہی ہے اور کہیں کسی اونچے ٹیلے پر کسی فقیر کا باغ (زیارت گاہ) ہے، جن لوگوں کو اپنے خالقِ حقیقی کی طلب ہوتی ہے، وہ (عشق حقیقی میں) اپنے گھر تک برباد کر دیتے ہیں، شور شرابے سے دور بھاگتے ہیں اور دور کہیں گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر اپنے مالک سے لو لگاتے ہیں''

اس بند کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شاعر دراصل اپنے مادرِ وطن کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ اس کے کوہسار و میدان میں رنگا رنگ کے عقیدوں کو ماننے والے لوگ آباد ہیں، بانسری سے مراد ہندوٗ اور فقیر کی درگاہ سے مراد مسلمان ہے اور شاعر اصل میں یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ رشیوں منیوں کی سرزمین ہے، جہاں مالک و خالق کی تلاش میں دور دور سے لوگ اپنا گھر بار تج کے آجاتے ہیں اور میرے وطن کے گھنے جنگلات میں ڈیرا ڈال دیتے ہیں۔

فطری بات یہ ہے کہ جب ایک پہاڑی شاعر فطرت نگاری کرتا ہے تو وہ اس کا آغاز بھی اپنے اردگرد پہرہ داری کرنے والے پہاڑوں اور مرغزاروں سے ہی کرتا ہے، مثال کے طور پر جہانگیر دانشؔ کا یہ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ے

ایہہ دیس ہے اُچیاں پہاڑاں دا
کہساراں تہ آبشاراں دا
اسیں خوشیاں نال ایتھے بہندے ہاں

ترجمہ:''یہ کوہساروں اور پہاڑوں کا دیس ہے، یہاں آبشار اور ندی نالے بہتے ہیں اور ہم سب اس ماحول میں خوشی خوشی مل جُل کر رہتے ہیں''

نوجوان پہاڑی شاعر ڈاکٹر فاروق انوار مرزا کسی تعارف کے محتاج نہیں، حالانکہ ان کا تعلق صوبہ جموں کے راجوری علاقے سے ہے لیکن وہ جب قدرتی مناظر کا انتخاب کرتے ہیں تو ان کے سامنے کشمیر کے زعفران زار، لالہ و سنبل اور نرگس وریحان آجاتے ہیں ،مثلاً مندرجہ ذیل دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ے

زعفراں، نرگس تواہڑے، حسن دے نے ترجمان
نالے جنت تھیں وی بہتر، ایہہ تواہڑے لالہ زار
ہو بہو دنیا نے اُپر نقشۂ جنت ہیں توں
کسے جا کھوڑاں نے بوٹے، کسے جا بیسے قطار

ترجمہ:''(اے میرے محبوب وطن) زعفران اور نرگس تیرے حسن کے ترجمان ہیں، مجھے تیرے لالہ زار جنت سے بھی بہتر معلوم ہوتے ہیں، تو دنیا میں جنت سراپا ہے، کہیں اخروٹ کے درخت ہیں اور کہیں بید کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں''

محمد عظیم خان پہاڑی زبان کے ایسے شاعر ہیں، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ ایک معیاری کلام لکھا ہے بلکہ انہوں نے شاعری سے متعلق پہاڑی کا قاعدہ بھی ترتیب دیا ہے، وہ عروض کے ماہر ہیں اور دیکھا جائے تو فطری طور پر ایک فطرت نگار شاعر ہیں، اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں:

ے

پربت فلک نماء ہین، اس دیس نے محافظ
ہر مکھ، ہمالیہ تہ پنچال خوبصورت
دریا تہ کوہ وصحراء، میدان، وادیاں وی
نقش ونقوش اسنے خدخال خوبصورت

''یہ وہ دیس ہے، جس کے فلک نماء پربت اس کے محافظ بن کر کھڑے ہیں، کہیں ہر ہر مکھ کی اونچی چوٹی ہے، کہیں ہمالہ کا پہاڑی سلسلہ ہے اور کہیں پیر پنچال کی پربتی دیوار، اس میں گیت گاتے دریا ہیں، کوہ وصحرا ہیں، وادیاں ہیں اور مجموعی طور پر اس کے نقش و نقوش اور خدوخال بہت ہی خوبصورت ہیں''

اس سے تھوڑا آگے قدم بڑھائیں تو ایک اور قد آور پہاڑی شاعر مجروح ملنگامی کی صورت میں اپنے ہاتھوں میں قدرتی مناظر کی قصیدہ کاری کرتے نظر آتے ہیں، غور فرمائیں ان کے نمونۂ کلام پر:

؎

برفاں والے ٹہاکے اِسدے، جسر اں چاندی چمکے
آ وَاِس دے گیت اُس گانواں نکے، بڑے رل کے

ترجمہ: ''یہاں برف پوش پہاڑ چاندی کی طرح چمکتے ہیں، آؤ ہم سب مل جل کر اپنے وطن کے گیت گائیں''

یہاں بھی شاعر ملی جلی تہذیب اور آپسی بھائی چارے کو قدرتی مناظر میں شامل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ ہم سب کو مل جل کر اپنے ملک یا وطن کے گیت گانے چاہیں کیونکہ اس کا سونا چاندی یا دیگر دولت (تہذیب وثقافت) ہم سب کی مشترکہ اثاث ہے''

بزرگ شاعر محمد سرور ریحان کا تعلق وادیٔ کشمیر کے ایک ایسے علاقے سے ہے، جہاں پہنچ کر مُرغانِ بے بال و پرٗ میں بھی جان آجاتی ہے، اس علاقے کا نام ٹنگمرگ ہے اور یہ کشمیر کے سب سے خوبصورت مقام گلمرگ کے راستے کا ایک پڑاؤ ہے، یہ کیونکر ممکن تھا کہ اتنے خوبصورت مناظر انہیں نغمہ خوانی پر نہ اُکساتے، ملاحظہ فرمائیں ان کا نمونۂ کلام:

؎

وادیٔ کشمیر آکھاں یا کہ جنت بے نظیر
ایہہ غریباں ناٹھکانہ، یا امیراں نی جگیر
اُچے، نیویں پہاڑ اسنے، پاجے والا ہے خمیر
ایہہ اساہڑی جان ہے تہ ایہہ اساہڑا ہے ضمیر

''ترجمہ: (شاعر کہتا ہے) میں حیران ہوں کہ میں اس جگہ کو وادیٔ کشمیر کہوں یا جنتِ بے نظیر کہوں، یہ غریبوں کا ٹھکانہ اور امیروں کی جاگیر ہے، اس کے اونچے پہاڑ انکساری کے ساتھ سر جھکائے کھڑے ہیں، یہ ہماری جان ہے اور یہی ہمارا ضمیر بھی

ہے“

اگلے قدم جو سر کردہ پہاڑی شاعر قدرتی مناظر کی تعریف میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے میں مصروف ہیں، ان کا نام ہی محمد خلیل جوہر ہے، وہ اپنے کلام کی بسم اللہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

ؔ

ایہہ دیس ہے اُچیاں پہاڑاں نا

سب پہاڑی دوستاں یاراں نا

اتھے جلوہ سب بہاراں نا

ایہہ دیس نہیں تلواراں نا

ترجمہ: ”یہاں اونچے اونچے پہاڑ ہیں، یہ پہاڑی دوستوں کا وطن ہے، یہاں بہاریں جلوہ افروز ہیں، یہ تلواروں (جنگ وجدل) کا دیس نہیں ہے“

شاعر اس بات پر مصر ہے کہ قدرت کے اس دلفریب علاقے میں اتنے خوبصورت مناظر کی بھرمار ہے اور یہاں چھیل چھبیلے، محبت اور انسانیت سے لبریز پہاڑی لوگ آباد ہیں اور یہاں جنگ وجدل، نفرت اور خون خرابے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

نذیر حسین اِنس کی منظر نگاری تھوڑی مختلف ہے، وہ جہاں قدرتی مناظر کی تعریف کرتے ہیں، وہیں اس سرزمین میں اُگنے والی اُن کھیتوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، جن سے ایسا سونا اُگتا ہے، جس کی بدولت ہم زندہ ہیں، ملاحظہ فرمائیں یہ شعر:

ؔ

فصلاں نی وردی سنگ ہر کھیت ہے دسنی ہریالی

اتھے باجرہ، گنا تہ چاول، دب مکئی، کنک کمانی ہے

”اس سرزمین نے فصلوں کی وردی پہنی ہوئی ہے اور اس کا ہر کھیت ہریالا ہے، یہاں چاول، گنا، باجرہ، مکئی اور گندم بھرپور مقدار میں پیدا ہوتی ہے“

اسی طرح عارف جرال عارف کا نمونۂ کلام کچھ اس طرح سے ہے:

ؔ

ایہہ تہرتی بڑی مہان چناں

ہے اِسنی اُچی شان چناں

ہاں میں اس تھیں قربان چناں

لکھ وار کہمائی جان چناں

ترجمہ: (اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر)''اے میرے چاند جیسے خوبصورت محبوب! میری دھرتی بہت عظیم ہے، اس کی بہت اونچی شان ہے، میں اس پر اپنی جان نچھاور کرتا ہوں اور لاکھوں بار اس کا صدقہ اُتارتا ہوں''

نئی نسل کے پہاڑی شعراء میں ایک معتبر نام پرویز مانوسؔ کا بھی ہے۔ پرویز کے کلام میں منظر نگاری یا فطرت پرستی کے اصول ذرا مختلف ہیں، نمونے کے طور پر یہ شعر:

ماہڑے دیش نی اُچی شان
رل مل رہنے سب انسان
رنگ برنگے پھُل ہین اس بچ
چڑیاں تہ بلبل ہین اس بچ

ترجمہ:''میرے وطن کی شان نرالی اور اعلیٰ ہے، یہاں سارے انسان مل جُل کے رہتے ہیں، اس میں رنگ برنگے پھول، پرندے اور بلبل ملتے ہیں''

غیاث الدین زیدیؔ کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

اسیں بچ کشمیر دے رہندے ہاں
اسیں سُکھ دی نیندر سیندے ہاں
تن من دا ایہہ سہارا ہے
سارے جگ تھیں ایہہ پیارا ہے

ترجمہ:''ہم سب کشمیر کے باشندے ہیں، ہم سب سکھ چین کی نیند سوتے ہیں (یا سوتے تھے) یہ ہمارے جسم و جان کا سہارا ہے اور ہمیں ساری دنیا سے محبوب ہے''
شاید یہ نظم سُن کر شاعر کا وہ محبوب حسد کی وجہ سے اس سے روٹھ بھی گیا ہو کیونکہ ایک محبوب کے سامنے دوسرے محبوب کی تعریف

اکثر مہنگی پڑتی ہےلیکن اس نے ایمانداری سے کام لیتے ہوئے صاف صاف اور منہ پر کہہ دیا ہے کہ اس وطن کے قدرتی نظارے ہمیں ساری دنیا سے پیارے ہیں اور اس دنیامیں آپ بھی شامل ہیں۔

زینت فردوس زینتؔ (مرحومہ) پہاڑی زبان وادب کے اولین کاروان میں شامل ایک ایسی حدی خواں شاعرہ تھیں، جن کے کلام میں شگفتگی، مٹھاس اور ٹھنڈک قدم قدم پر ملتی ہے، اُن کا ناول ''چٹی چادر پیارنی'' کی کتابت کا راقم کو موقعہ ملا تھا، جو اول تا آخر قدرت کے دلفریب نظاروں سے لبریز تھی، اُن کی شاعری کا بھی یہی حال تھا، ملاحظہ فرمائیں یہ بند:

کوُہلاں، ناڑے، جھرنے، تھاں تھاں بگنے
رب رحیم وکریم مُچ مہربان ماہڑا

ترجمہ: ''یہاں پرندی، نالے، دریاء اور جھرنے جگہ جگہ ملتے ہیں، میرا رب بڑا رحیم وکریم اور مہربان ہے (جس نے مجھے اس پیاری سرزمین پر پیدا کیا ہے)

ریحانہ عزیز ایک نوجوان پہاڑی شاعرہ ہیں، ریڈیو اور ٹیلیویژن سے وابستہ ہیں، حالانکہ پیشے سے اُستاد ہیں لیکن چونکہ اوڑی کے خوبصورت قدرتی مناظر کی خوش قسمت بانہوں میں جوان ہوئی ہیں، اس لئے اُن مناظر کا قرضہ اُتارنا کیسے بھول سکتی ہیں، نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں:

کشمیر بچ ریحانہ! بہاردی ایہہ محفل
جنگلاں دی رت رنگیلی تہ کوکدی ہے کوئل
پھلاں نے رنگ برنگے لباس کدھروں آندے
قالین سبز کہیًا دی، لگدا ہے جیہاں مخمل

ترجمہ: ''اے ریحانہ! یہ محفل کشمیر ہے، جہاں جنگلات کی رنگیلی فضاء میں کوئل گیت گا گا کر بلا رہی ہے، نہ جانے پھولوں نے یہ رنگ برنگے لباس کہاں سے لائے ہیں، پھول، پتوں نے خاموشی سے سر جھکا کر سلام کیا ہے اور بلبل قدرت کی ثناء خوانی میں مصروف ہے''

عبدالہادی قریشی اپنے اشعار میں فطرت نگاری کا وہ نظارہ پیش کرتے ہیں، جو صرف پہاڑی تہذیب وثقافت کا ہی حصہ ہوسکتا

ہے۔

اُچے تُنگاں، دیاراں، بیاڑاں دا دیش
کھیئے، مکھناں تہ دُدھاں، کلاڑیاں دا دیش
اتھے بسن پہاڑی، گُجر، تہ کشمیری

ترجمہ: ''اس دیس میں اونچے درختوں سے بھرے جنگلات ہیں، جن میں چیڑ، دیودار اور کائرو کے بے شمار اشجار ہیں، یہ پیارے اور غیرت مند پہاڑی لوگوں کا ملک ہے، یہاں پر گھی مکھن اور دودھ سے بنی ہوئی دیگر اشیاء وافر مقدار میں ملتی ہیں اور اس میں پہاڑی، کشمیری اور گوجر مل جُل کر رہتے ہیں''

عبدالحنان طالبؔ کی منظر نگاری اس سے بھی دلچسپ ہے، ملاحظہ کریں نمونۂ کلام:

اُچیاں پہاڑاں دیاں دیواراں، جنگلاں دا سبزہ زار
ٹھنڈے پانی ندیاں دے تہ چڑیاں دے ڈار
قدرت دے نظارے دکھو، جنت بے نظیر
اللہ کیتا جگ تھیں پیارا ماہڑا وطن کشمیر

ترجمہ: ان مناظر میں اونچے پہاڑوں کی دیواریں، سرسبز جنگلات ہیں، ٹھنڈے پانی کی ندیاں اور پرندوں کی چہچہاہٹ ہے، قدرت کے یہ نظارے دیکھ کر ایک بے مثال جنت نظروں کے سامنے آ جاتی ہے... اور... شکر ہے اس اللہ تبارک وتعالیٰ کا جس نے میرے وطن کشمیر کو ساری دنیا سے خوبصورت بنایا''

ان سطور میں بھی شاعر کا راز فاش ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ وہ جن نظاروں کو جنت سے تشبیہ دے رہا ہے، وہ اس کے اپنے مادرِ وطن 'کشمیر' کے نظارے ہیں، یعنی ایک بار پھر یہ بات ثابت ہو جاتی نظر آتی ہے کہ حب الوطنی اور فطرت نگاری میں کوئی زیادہ بڑا فرق نہیں، دونوں باتیں یا تو ایک ہی ہیں یا پھر ایک سکے کے دو رُخ ہیں۔ راجہ نذیر احمد نادمؔ کے منتخبہ کلام میں سے ملتی جلتی مثال ملاحظہ فرمائیں

جنت دا ہک ٹوٹا ہے ایہہ، مٹی اِس دی سونا ہے
رشک کرے دنیا اس اُپر، قدرت دا ہک نمونہ ہے

ترجمہ: ''یہ جنت کا ایک حصہ ہے، اس کی مٹی بھی سونا ہے، ساری دنیا اس پر رشک کرتی ہے اور یہ قدرت کا ایک انمول نمونہ ہے''

راقم الحروف (مقبول ساحلؔ) کی پہلی پہاڑی تخلیق ''پر چھانواں'' کے نام سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں اڑھائی سو کے قریب نظمیں، غزلیں، نعتِ شریف، مرثیے، حب الوطنی کے نغمے اور گیت شامل ہیں، میری جن منظومات میں مجھے قدرت کے دلفریب نظاروں نے 'ربِ ارنی' پر مجبور کیا ہے، ان میں ''میں اس بستی دا باشندہ'' میں سے ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

؎

اوہ جنت دا ہک دروازہ یا عرشِ بریں دا حصہ ہے
ایہہ کہانی نیہہ اسماناں دی، ایہہ پاک وطن دا قصہ ہے
اوہ لال گلاباں دی خوشبو، اوہ نیلے شنگراں دے منظر
ہر ٹہنا کا ہے گلشن، گلشن، ہر منظر ہے معطر، معطر

ترجمہ: (میں ایک ایسی سرزمین کی بات کر رہا ہوں) جو جنت کا ایک دروازہ ہے یا عرشِ بریں کا کوئی حسین و جمیل حصہ! یہ کسی آفاقی بہشت کی کہانی نہیں بلکہ (میرے) پاک وطن کا قصہ ہے، جہاں سرخ گلابوں کی خوشبو اور نیلے آسمان کی چادر ہے، جہاں ہر پہاڑ ایک گلشن کی طرح ہے اور جہاں کا ہر منظر خوشبوؤں سے معطر ہے''

اسی طرح کی دیگر منظومات میں ''اس وادی نچ''، ''کشمیر''، ''چلی خوشبو بہاراں دی'' اور ''فطرت دے پروانے لوک'' میں بھی اسی مضمون پر بات کی گئی ہے، پیش ہیں ''فطرت دے پروانے لوک'' نظم سے دو اشعار۔

؎

پہاڑاں دی چھُو لی دے واسی، فطرت کے پروانے لوک
کُجھ نہ پچھو، کسراں جیندے مستی نچ مستانے لوک
گاندے چھمر، نچدے پکھڑوں، جنگل بیلے دی دنیا
اپنے اندر شہر بسا کے شہراں تھیں انجانے لوک

ترجمہ: یہ پہاڑوں کی جھولی میں پلنے والے (پہاڑی) لوگ ہیں، یہ فطرت کے پروانے ہیں، مجھ سے مت پوچھو کہ یہ مستانے لوگ کیسی مستی میں جیتے ہیں (ان کے سامنے) گیت گاتے جھرنے ہیں، ناچتے اور چہچہاتے پرندے ہیں، جنگلات اور چراگاہیں ہیں، یہ لوگ اپنے دلوں میں شہر بسا کر جیتے ہیں اور شہروں کے شور شرابے سے دور رہنا پسند کرتے ہیں''

اسی ذمرے میں راقم کی نظم ''وصیت''، ''عرضی دل دی'' ''رُت بہاراں دی''، ''ماہی دیاں وطناں'' ہور ''رُت ساون دی'' بھی شامل کی جاسکتی ہے۔ اگر ان سبھی منظومات میں سے نمونہ کلام پیش کیا جائے تو مضمون کافی طول پکڑ جائے گا، اس لیے اتنے پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مضمون کے آخر پر خواجہ شبیر الزماں پیر بیگھوی کی اس تحریر کو شامل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جو راقم کو انٹرنیٹ کی مدد سے حاصل ہوئی:

''مٹی اور خاک وطن سے متعلق ہر ایک ادب میں تذکرہ مل جائے گا۔ اس تذکرہ کے بغیر وطن کے دلفریب اور قدرتی مناظر کا تذکرہ، سب کچھ ادھورا رہ جائے گا۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ''خاک وطن کا مجھ کو ہر ایک ذرہ دیوتا ہے''

الغرض قدرتی مناظر یا با الفاظ دیگر حب الوطنی کی اس محبت کی علامت پہاڑی شاعری میں بکثرت موجود ہے۔ جہاں کسی نہ کسی صورت میں وطن پرستی اور مادر گیتی یا حب الوطنی کا تذکرہ مل جاتا ہے اور جیسا کہ مضمون کی ابتداء میں اشارہ دیا جا چکا ہے کہ پہاڑی شعراء کا اکثر کلام حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسول سے شروع ہوتا ہے اور اس کا اگلا قدم قدرت کے دلفریب مناظر کی تعریف کرنا ہوتا ہے کیونکہ یہ نظارے بھی در حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی حسین وجمیل تخلیق ہوتے ہیں اور ان کی تعریف کا مطلب اللہ جلہ سبحانہُ کی تعریف کرنا ہے۔ مٹی سے جڑے لوگ وہ ہیں، جنھوں نے تبدیلی اقامت نہیں کی اور ایک ہی جگہ مقیم رہے۔ اسی طرح وطنیت کا تصور ہر جگہ موجود ہے۔ بہر حال وطن کی مٹی اور وہاں کی خوشبو ہر ایک انسان کے خمیر میں رچی بسی ہوتی ہے۔ وہ اس کی روح میں زندہ ہے اور اس کی یادوں کے گلزار میں موجود ہے۔ وطن میں موجود قدرت کی دلفریبی کے نام سے جذباتی ہونا اور اسے یاد کر کے آنسو بہانہ فطری تقاضہ ہے لیکن اس سے جدائی کی اپنی اہمیت ہے اور حقیقت یہ ہے طبی اہمیت۔ انسان مٹی سے پیدا ہوا اور مٹی میں ہی مل جائے گا۔ یہ بات جدا ہے لیکن پیدا ہونے کے بعد سے مرنے کے بعد تک انسان اور مٹی کا ساتھ ہر قدم پر ہے۔ بچے کا پہلا قدم زمین پر بے انتہا اہمیت کا حامل ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ انسان بھی مٹی سے دور ہوتا جاتا ہے اور جب مٹی سے دور ہو جاتا ہے تو بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق دھرتی (یا وطن) ماں ہوتی ہے، مسلمانوں نے بھی کم وبیش شاعری میں اسی طرح کے جذبات وخیالات پیش کئے ہیں اور اپنی دھرتی کو ''مادرِ وطن'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ ہر ماں کے قدموں میں جنت ہوتی ہے یعنی ماں کے قدموں میں رہنا جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے ہر حساس شاعر کو وطن کی جھولی میں جنت کے نظارے دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان کی دل کھول کر تعریف کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ لوگ جو ماں کے قدموں میں رہتے ہیں، ہر بیماری سے محفوظ رہتے ہیں۔ کیونکہ جنت میں بیماریاں نہیں ہوا

کرتیں۔صبح سورج نکلنے کا نظارہ،شام کوسورج کے غروب ہونے کا اور چاند کے نمودار ہونے کا منظر، پھولوں پر شبنم کے قطروں کی چمک اور مٹی کی سوندھی مہک، یہ قدرتی حسن ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے، جولوگ مادرِوطن کے حسین وجمیل قدرتی مناظر سے لاتعلق ہوتے ہیں،اس لئے قدرت سے دوررہ کرانہوں نے جوحاصل کیا،وہ بقول کرشن چندر یہ تھا:۔

''اُس کے پاس کیانہیں تھا! عالیشان بنگلہ،خوبصورت بیوی، بینک بیلنس، بلڈ پریشر اور بواسیر "

اسی بات کوبیسویں صدی کے عظیم مفکر اور ڈرامانویس جارج برناڈ شاہ نے اپنے ایک مضمون Miseries of the rich ""میں تفصیل سے لکھاہے کہ بڑے آدمیوں کی پریشانیاں کیا کیا ہیں اوران کے اسباب کیا ہیں اوران کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ اپنی مٹی سے دور ہوجاتے ہیں،ان کے قدم زمین میں اُگی ہوئی گھاس کی نرم مخمل پرنہیں پڑتے ، وہ تازہ ہواؤں سے محروم ہوتے ہیں اورانہیں اپنی سرزمین کی کسی بھی چیز کا علم نہیں ہوتا، ماسوائے اُن تجارتی اشیاء کے،جس کی خریدوفروخت میں وہ مصروف رہتے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ فلک بوس اورسرسبز پربت، نرگس ونسترن کی مست کردینے والی خوشبو سے لبریز مرغزار، اپنے سر پر برف کی سفید چادر سجائے ہوئے، نئی نویلی دلہن کی طرح سجے سنورے کوہسار، قدرت کے دلفریب نظارے، صاف وشفاف آب وہوا اور شور شرابے سے پاک ایک ماحول دستیاب ہوتو شاید ہی کوئی بدذوق بندہ ہوگا، جس کا دل قدرت کی تعریف اور خالقِ کائنات کی مدح سرائی کی جانب متوجہ نہ ہو...اوراگراس کے ساتھ ساتھ وہاں آبادلوگوں کے دلوں میں مہرومحبت، ہمدردی اور بھائی چارے کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر موجزن ہوں، حسن وعشق بےنقاب آمنے سامنے جلوہ افروز ہوں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسے ماحول میں پلنے والا شاعر، افسانہ نگار یاناول نگاران مناظر کا مدح خواں نہ ہو؟ قدرت نے اگرچہ پہاڑی زبان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دُور دراز، دشوار گزار اور زندگی کی سہولیتوں سے محروم ایک سخت ماحول میں پیدا کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ قدرت کے بہت ممنون ومشکور ہیں جس نے ان کو وہ سارے سامان میسر رکھے ہیں جوان کو مستانہ بنا کراپنے ماحول کا مداح خوان کردینے کے لیے کافی ہیں، بقولِ شاعرمشرق علامہ اقبالؒ

؎ فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یابندۂ صحرائی، یامردِ کوہستانی

الغرض فطرت کی اہمیت اس کے استعمال کے ساتھ ہے،اس کی افادیت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس سے قریبی رشتہ اور تعلق رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اگراس نہج پرسروے کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہوجائے گی کہ جن لوگوں کا تعلق دیہاتوں سے ہے، وہ فطرت کے بہت قریب ہیں۔اُنہیں موجودہ دور کی بہت ساری بیماریاں نہیں لگتیں۔جو جدیدیت، ماڈرن ازم اوراعلی سوسائٹی کے نام پر آج کل کے انسان نے خود مول لے رکھی ہیں۔اس لحاظ سے بھی پہاڑی عوام بہت خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں، وہ اپنی مٹی، اپنے

وطن اوراس کے حسین وجمیل نظاروں کے ساتھ پیوستہ ہیں اوران کے ہاں امیدِ بہار کو اولین ترجیح حاصل ہے۔

(نوٹ: مضمون نگار ایک کشمیری صحافی اوراوردو و پہاڑی زبانوں میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں)

☆☆☆

رابطہ:

محمد مقبول ساحل، اڑحال کوکرناگ، ضلع اسلام آباد کشمیر192202

موبائل نمبرات:9419022177, 9797248039

E mail: sahilmaqbool@gmail.com

معرفت: روزنامہ رائزنگ کشمیر، پریس اینکلیو، ریذیڈنسی روڈ سرینگر کشمیر190001